دفتر پہنچا، تو برآمدے میں مال تولا جا رہا تھا۔ میز پر روپے پیسے رکھے جا رہے تھے اور رما فکر میں ڈوبا بیٹھا تھا۔ کس سے صلاح لے، اسے آج اپنے اوپر غصہ آ رہا تھا کہ اس نے شادی ہی کیوں کی۔

جب وہ گھر کی حالت سے واقف تھا تو اس نے شادی سے انکار کیوں نہ کر دیا۔ آج اس کا جی مطلق کام میں نہ لگا۔ معین وقت سے پہلے اٹھ کر گھر چلا گیا۔

جالپا نے اسے دیکھتے ہی پوچھا۔ ''میری چٹھیاں چھوڑ تو نہیں دیں؟''

رما نے بہانہ کیا۔ ''مطلق یاد نہ آئی۔ جیب میں پڑی رہ گئیں۔''

جالپا: ''یہ بہت اچھا ہوا۔ لاؤ مجھے دے دو۔ اب نہ بھیجوں گی۔''

رما: ''کیوں؟ کل بھیج دوں گا۔''

جالپا: ''نہیں، اب مجھے بھیجنا ہی نہیں ہے۔ میں کچھ ایسی باتیں لکھ گئی تھی، جو نازیبا تھیں۔ اگر تم نے خط چھوڑ دیئے ہوتے تو مجھے بڑا رنج ہوتا۔ میں نے ان میں تمہاری شکایت کی تھی۔''

یہ کہہ کر وہ مسکرائی۔

رما: ''شوہر بدنیت ہے، دغاباز ہے، حیلہ ساز ہے۔ اس کی اگر تم نے شکایت کی تو کیا بے جا کیا؟''

جالپا نے گھبرا کر پوچھا۔ ''تم نے خط پڑھ لیے تھے کیا؟ تب تو تم مجھ سے ناراض ہو گے۔''

رقت سے جالپا کی آواز رک گئی۔ اس کا سر جھک گیا اور جھکی ہوئی آنکھوں سے آنسوؤں کی بوندیں آنچل پر گرنے لگیں۔ ایک لمحہ میں اس نے دل سنبھال کر

کہا۔ ''مجھ سے بہت بڑی خطا ہوئی ہے، جو سزا چاہے دو۔ پر ہم سے ناراض مت ہو۔ ایشور جانتے ہیں تمہارے جانے کے بعد مجھے کتنا افسوس ہوا۔ میری قلم سے نہ جانے کیسے وہ باتیں نکل گئیں۔''

جالپا جانتی تھی کہ رمانا تھ کو زیوروں کی فکر مجھ سے ذرہ بھر بھی کم نہیں ہے، لیکن ہمدردوں سے اپنی داستان غم کہتے وقت ہم اکثر مبالغہ کر جایا کرتے ہیں، جو باتیں پردے کی سمجھی جاتی ہیں، ان کا ذکر کر دینے سے قربت اور یگانگت کا اظہار ہوتا ہے۔ دوستوں کی ہمدردی حاصل کرنے کا یہ عام طریقہ ہے۔

رما جالپا کے آنسو پونچھتا ہوا بولا۔ ''میں تم سے ناخوش نہیں ہوں۔ ناخوش ہونے کی تو کوئی بات ہی نہیں ہے۔ امید کی تاخیر ہی مایوسی ہے، کیا میں اتنا نہیں جانتا۔ اگر تم نے مجھے منع نہ کر دیا ہوتا تو اب تک میں نے کسی نہ کسی طرح دو ایک چیزیں بنوا دی ہوتیں۔ مجھ سے غلطی یہ ہوئی کہ میں نے تم سے صلاح لی۔ اس وقت مجھے یہ خیال نہ رہا کہ ایسی حالتوں میں آدمی خواہش رکھنے پر بھی نہیں نہیں کرنے پر مجبور ہے۔ اب میں وہ غلطی نہ کروں گا۔''

جالپا نے متفکرانہ انداز سے پوچھا۔ ''تو کیا قرض لاؤ گے؟''

رما: ''کیا ہرج ہے؟ جب سود نہیں دینا ہے تو جیسے نقد ویسے ادھار۔ قرض سے دنیا کا کام چلتا ہے۔ کون قرض نہیں لیتا۔ یوں روپے ملتے بھی ہیں، تو اللے تللے خرچ ہو جاتے ہیں۔ قرض سر پر سوار ہوگا تو اس کی فکر ہاتھ کو روکے رہے گی۔''

جالپا: ''میں تمہیں فکر میں ڈالنا نہیں چاہتی۔ اب میں بھول کر بھی زیوروں کا نام نہ لوں گی۔''

رما: ''نام تو تم نے کبھی نہیں لیا، لیکن تمہارے نام نہ لینے سے میرا فرض تو پورا نہیں ہو جاتا۔ تم قرض سے ناحق ڈرتی ہو۔ روپے جمع ہو جانے کے انتظار میں بیٹھا رہوں گا تو شاید کبھی بھی جمع نہ ہوں گے۔''

جالپا: ''مگر پہلے کوئی چھوٹی سی چیز لانا۔''

رما: ''ہاں، ہاں ایسا تو کروں گا ہی۔''

رما بازار چلا تو خوب اندھیرا ہو چلا تھا۔ دن رہتے جاتا تو یہ خوف تھا کہ اس پر دوستوں کی نگاہ پڑ جاتی۔ منشی دیانا تھ ہی دیکھ لیتے۔ وہ اس معاملے کو پوشیدہ ہی رکھنا چاہتا تھا۔

(13)

صرافے میں گنگو کی دکان مشہور تھی۔ گنگو تھا تو برہمن، مگر تھا پکا بنیا۔ اس کی دکان پر ہمیشہ گاہکوں کی بھیڑ لگی رہتی تھی۔ اس کا تقدس گاہکوں میں یقین پیدا کرتا تھا۔ دوسری دکانوں پر لوگوں کو ٹھگے جانے کا خوف ہوتا تھا۔ اس دکان پر دغابازی کا اندیشہ نہ تھا۔ گنگو نے رما کو دیکھتے ہی مسکرا کر کہا۔ ''آیئے بابو صاحب اوپر آیئے۔ منیم جی آپ کے واسطے پان منگواؤں۔ کیا حکم ہے بابو جی؟ آپ تو کبھی آتے ہی نہیں۔ غریبوں پر بھی کبھی کبھی کرم کیا کیجیے۔''

گنگو کے اخلاق نے رما کی ہمت کھول دی۔ اگر اس نے اصرار نہ کیا ہوتا تو شاید رما کبھی دکان پر جا ہی نہ سکتا۔ دکان پر جا کر بولا۔ ''یہاں ہم جیسے مزدوروں کا کہاں گزر ہے مہاراج، گرہ میں کچھ ہو تو؟''

گنگو نے ان کے بیٹھنے کے لیے ایک کرسی منگوائی اور بولا۔ ''یہ آپ کیا

فرماتے ہیں۔ بابو صاحب آپ کی دکان ہے، جو چیز چاہیے لے جائیے۔ دام آگے پیچھے ملتے رہیں گے۔ ہم لوگ آدمی کو پہچانتے ہیں، ایسی بات نہیں ہے۔ دکھاؤں کوئی جڑاؤ چیز؟ کوئی کنگن؟ کوئی ہار، ابھی حال ہی میں دلی سے مال آیا ہے!''

''کوئی ہلکے داموں والا ہار دکھائیے!''

''یہی کوئی سات آٹھ سو کا؟''

''اجی نہیں، کوئی چار سو تک حد ہے۔''

گنگو نے زیوروں کا صندوقچہ منگا کر کہا۔ ''میں آپ کو دونوں دکھائے دیتا ہوں، جو پسند آئے رکھ لیجیے گا۔ ہمارے یہاں کسی طرح کا دنگل پھسل نہیں ہے۔ بابو صاحب اس کی آپ ذرا بھی فکر نہ کریں۔ پانچ برس کا لڑکا ہو یا سو برس کا بوڑھا، سب کے ساتھ ایک بات رکھتے ہیں۔ مالک کو بھی ایک دن منہ دکھانا ہے۔''

گنگو نے ہار نکال نکال کر دکھانے شروع کیے۔ رما کی آنکھیں کھل گئیں۔ طبیعت لوٹ پوٹ ہو گئی۔ کیا صفائی تھی۔ رنگینیوں کی خوبصورت سجاوٹ۔ کتنی آب و تاب، آنکھیں جھپکی جاتی تھیں۔ رما نے سوچ رکھا تھا، سو روپیہ ادھار نہ رکھوں گا، لیکن چار سو والا ہار آنکھوں میں کچھ نہ جچتا تھا اور جیب میں تھے کل تین سو روپے۔ سوچا یہ ہار لے گیا اور جالپا نے پسند نہ کیا تو فائدہ ہی کیا۔ ایسی چیز لے جانی چاہیے کہ وہ دیکھتے ہی پھڑک اٹھے۔ یہ جڑاؤ ہار اس کی گردن میں کتنا خوشنما معلوم ہوگا۔ وہ ہار ایک ہزار مرصع آنکھوں سے گویا رما کے دل کو کھینچنے لگا۔ وہ ایک

سکوت کے عالم میں اس کی طرف دیکھتا رہا، مگر منہ سے ایک لفظ بھی نہ نکلتا تھا۔ کہیں گنگو نے تین سو روپے ادھار ماننے سے انکار کر دیا تو اسے کتنا شرمندہ ہونا پڑے گا۔ گنگو بشرے سے اس کے دل کی بات تاڑ کر بولا۔ ''آپ کے لائق تو بابو جی یہی چیز ہے، اندھیرے گھر میں رکھ دیجئے تو اجالا ہو جائے۔''

رما نے شرماتے ہوئے کہا۔ ''پسند تو مجھے بھی یہی ہے، لیکن میرے پاس کل تین سو روپے ہیں۔ یہ سمجھ لیجیے.....!''

گنگو نے خلوص کے ساتھ کہا۔ ''بابو جی روپے کا ذکر ہی نہ کیجیے۔ حکم ہو تو دس ہزار کا مال ساتھ بھیج دوں۔ مرضی ہو تو ایک آدھ چیز اور دکھاؤں۔ ایک شیش پھول بن کر آیا ہے۔ بس یہی معلوم ہوتا ہے کہ گلاب کا پھول کھلا ہوا ہے۔ دیکھ کر جی خوش ہو جائے گا اور دام بھی کچھ ایسا بھاری نہیں ہے۔ آپ کو ایک ڈھائی سو میں مل جائے گا۔''

رما نے مسکرا کر کہا۔ ''مہاراج بہت باتیں بنا کر الٹے چھرے سے نہ مونڈ لیجیے گا۔ اس معاملے میں میں بالکل اناڑی ہوں۔''

گنگو: ''ایسا نہ کہو بابو جی! آپ چیز لے جائیے۔ بازار میں دکھا لیجیے۔ اگر کوئی ڈھائی سو سے کوڑی کم میں دے تو میں مفت میں دے دوں گا۔''

شیش پھول آیا، سچ مچ گلاب کا پھول تھا، جس پر ہیرے کی کنیاں اوس کی بوندوں کی طرح چمک رہی تھیں۔ رما کی ٹکٹکی بندھ گئی۔

گنگو: ''ڈھائی سو تو کاریگر کی صفائی کا انعام ہے بابو جی، یہ وہ چیز ہے؟''

رما: ''ہاں ہے تو بہت خوبصورت، مگر ایسا نہ ہو کل ہی دام کا تقاضا کرنے لگو۔

میں خود ہی جہاں تک ہو سکے گا، جلد دے دوں گا۔''

گنگو نے دونوں چیزیں خوبصورت مخملی کیسوں میں رکھ کر رما کو دے دیں۔ رما کی مسرت کا اس وقت اندازہ نہ تھا، مگر یہ خالص مسرت نہ تھی، اس میں ایک اندیشہ کی آمیزش بھی تھی۔ یہ اس بچے کی خوشی نہ تھی، جس نے ماں سے پیسے مانگ کر مٹھائی لی ہو، بلکہ اس بچے کی خوشی تھی، جس نے پیسے چرا کر لی ہو۔ اسے مٹھائیاں میٹھی تو لگتی ہیں، لیکن دل کانپتا رہتا ہے کہ کہیں گھر چلنے پر مار نہ پڑنے لگے۔ ساڑھے چھ سو روپے ادا کرنے کی تو اسے فکر زیادہ نہ تھی۔ اگر زمانہ موافق ہو تو چھ مہینے میں بے باق کر سکتا ہے۔ خوف یہی تھا کہ بابو جی سنیں گے تو ضرور ناراض ہوں گے۔ لیکن جوں جوں آگے بڑھتا گیا، جالپا کو ان زیوروں سے آراستہ دیکھنے کے خواہشمند شوہر کا اشتیاق اس خوف پر غالب آتا جاتا تھا۔ گھر پہنچنے کی عجلت میں اس نے سڑک چھوڑ دی اور ایک گلی میں گھس گیا۔ گھنا اندھیرا چھایا ہوا تھا۔ بادل تو اسی وقت آ گئے تھے، جب وہ گھر سے چلا تھا۔ وہ گلی میں گھسا ہی تھا کہ پانی کی بوندیں چھروں کی طرح اوپر پڑیں۔ جب تک چھتری کھولے، وہ لت پت ہو چکا تھا۔ اسے دہشت ہوئی۔ اس اندھیرے میں کوئی آ کر دونوں چیزیں نہ چھین لے۔ اندھیری گلیوں میں خون تک ہو جاتے ہیں۔ پچھتانے لگا۔ اس طرف ناحق آیا۔ دو چار منٹ دیر ہی میں پہنچتا، تو ایسی کون سی آفت آ جاتی۔ مارے خوف کے کسی طرح گلی کا خاتمہ ہوا اور سڑک ملی۔ لالٹین نظر آئی۔ روشنی کتنی اعتقاد انگیز چیز ہے۔ اس کا آج اسے عملی تجربہ ہوا۔

وہ گھر پہنچا تو دیا ناتھ حقہ پی رہے تھے۔ ان کی آنکھ بچا کر وہ اندر جانا ہی چاہتا

تھا کہ انہوں نے اسے ٹوکا۔ ''اس وقت کہاں گئے تھے؟''

رما نے انہیں کچھ جواب نہ دیا۔ کہیں وہ اخبار سنانے لگیں تو گھنٹوں کی خبریں لیں۔ سیدھا اندر جا پہنچا۔ جالپا دروازے پر کھڑی اس کی راہ دیکھ رہی تھی۔ فوراً اس کے ہاتھ سے چھتری لے لی اور بولی۔ ''تم تو بالکل ہی بھیگ گئے۔ کہیں ٹھہر کیوں نہ گئے؟''

رما: ''پانی کا کیا ٹھکانہ، رات بھر برستا رہے۔''

یہ کہتا ہوا وہ اوپر چلا گیا۔ اس نے سمجھا تھا، جالپا بھی پیچھے پیچھے آتی ہوگی۔ پر وہ نیچے بیٹھی اپنے دیوروں سے باتیں کر رہی تھی۔ گویا اسے زیوروں کی یاد ہی نہیں ہے۔ جیسے وہ بالکل بھول گئی ہے کہ رما صرافے سے آیا ہے۔

رما نے کپڑے بدلے اور دل میں جھنجھلاتا ہوا نیچے آیا۔ اسی وقت دیا ناتھ کھانا کھانے آ گئے۔ سب لوگ کھانا کھانے بیٹھ گئے۔ جالپا نے ضبط تو کیا، پر اس اضطراب کی حالت میں آج اس سے کچھ کھایا نہ گیا۔ جب وہ اوپر پہنچی تو رما چارپائی پر بیٹھا ہوا تھا۔ اسے دیکھتے ہی مذاق کر کے بولا۔ ''آج تو صرافے کا جانا بیکار ہو گیا۔ ہار کہیں تیار ہی نہ تھا۔ بنانے کو کہہ آیا ہوں۔''

جالپا کا اشتیاق سے چمکتا ہوا چہرہ ماند پڑ گیا۔ بولی۔ ''وہ تو میں پہلے ہی جانتی تھی۔ بنتے بنتے پانچ چھ مہینے تو لگ ہی جائیں گے؟''

رما: ''نہیں جی، بہت جلد بنا دے گا، قسم کھا رہا ہوں۔''

جالپا: ''اونہہ، جب چاہے دے۔''

جالپا منہ پھیر کر لیٹنے جا رہی تھی کہ رما نے زور سے قہقہہ مارا۔ جالپا چونک

پڑی۔ سمجھ گئی رما نے شرارت کی تھی۔ مسکراتی ہوئی بولی۔ ''تم بھی بڑے نٹ کھٹ ہو، کیا لائے؟''

رما: ''کیسا چکمہ دیا؟''

جالپا: ''یہ تو مردوں کی عادت ہی ہے، تم نے نئی بات کیا کی؟''

جالپا دونوں زیوروں کو دیکھ کر باغ باغ ہو گئی۔ اس کے دل میں مسرت کی موجیں سی اٹھنے لگیں۔ وہ اپنے جذبات کو چھپانا چاہتی تھی کہ رما اسے اوچھی نہ سمجھنے لگے، مگر ایک ایک عضو کھلا جاتا تھا۔ مسکراتی ہوئی آنکھیں، دہکتے ہوئے رخسار اور کھلے ہوئے ہونٹ افشائے راز کیے دیتے تھے۔ اس نے ہار گلے میں پہنا۔ شیش پھول سجایا اور خوشی سے متوالی ہو کر بولی۔ ''تمہیں دعا دیتی ہوں، ایشور تمہاری ساری آرزوئیں پوری کرے۔''

آج جالپا کی وہ تمنا پوری ہوئی، جو بچپن ہی سے اس کے تخیل کا ایک زریں خواب، اس کی امیدوں کا مرکز بنے ہوئے تھے۔ آج اس کی وہ سادھ پوری ہوئی۔ اگر مانکی یہاں ہوتی تو وہ سب سے پہلے یہ ہار اسے دکھاتی اور کہتی تمہارا ہار تمہیں مبارک ہو۔

رما پر گھڑوں نشہ چڑھا تھا۔ آج اسے پہلی بار زندگی کا مزا حاصل ہوا۔

جالپا نے پوچھا۔ ''جا کر اماں کو دکھا آؤں؟''

رما نے جوانکسار دکھا کر کہا۔ ''اماں کو کیا دکھانے جاؤ گی، ایسی کون سی بڑی چیزیں ہیں؟''

جالپا: ''اب تم سے سال بھر تک اور کسی چیز کے لیے نہ کہوں گی۔ یہ روپے ادا

کر دوں گی۔میرے دل کا بوجھ ہلکا ہوگا۔"

رمانے پرتر دد انداز سے کہا۔"روپوں کی کیا فکر؟ ہیں ہی کتنے؟"

جالپا:"ذرا ان کو دکھا آؤں، دیکھوں تو کیا کہتی ہیں؟"

رما:"مگر یہ کہنا ادھار لائے ہیں۔"

جالپا اسی طرح دوڑی ہوئی نیچے گئی۔گویا اسے وہاں کوئی خزانہ مل جائے گا۔

آدھی رات گزر چکی تھی۔رما خوشی کی نیند سو رہا تھا۔جالپا نے چھت پر آ کر ایک بار آسمان کی طرف دیکھا۔شفاف چاندنی چھٹکی ہوئی تھی۔وہ کاتک کی چاندنی، جس میں نغمے کا سکون ہے اور شعر کی روحانیت۔اس نے کمرے میں اپنی صندوقچی کھولی اور اس میں سے وہ کانچ کا چندن ہار نکالا، جسے پہن کر وہ ایک دن پھولی نہ سمائی تھی۔مگر اب اس نئے ہار کے سامنے اس کی چمک اس طرح ماند پڑ گئی تھی، جیسے اس شفاف چاندنی کے سامنے تاروں کی روشنی۔اس نے اس نقلی ہار کو توڑ ڈالا اور اس کے دانوں کو نیچے گلی میں پھینک دیا۔اس طرح جیسے پوجا ختم ہونے کے بعد کوئی بھگت مٹی کی مورتیوں کو پانی میں فنا کر دیتا ہے۔

(14)

اس دن سے جالپا کی زندگی میں ایک نیا پہلو رونما ہوا۔رما نہانے جاتا تو اسے اپنی دھوتی چنی ہوئی ملتی۔طاق پر تیل اور صابن بھی رکھا ہوا پاتا۔جب وہ دفتر جانے لگتا تو جالپا اس کے کپڑے لا کر سامنے رکھ دیتی۔پہلے پان مانگنے پر ملتے تھے، اب زبردستی کھلائے جاتے تھے۔جالپا اس کا رخ دیکھا کرتی۔اسے کچھ کہنے کی ضرورت نہ تھی۔یہاں تک کہ جب وہ کھانے بیٹھتا تو وہ پنکھا کرتی۔پہلے وہ

بڑے جبر سے کھانا پکانے جایا کرتی تھی اور اس پر بھی بیگاری ٹالتی تھی۔ اب وہ بڑی خوشی سے رسوئی میں جاتی۔ چیزیں وہی پکائی جاتی تھیں، مگر ان میں کچھ زیادہ مٹھاس آ گئی تھی۔ رما کو ان الفت آمیز دلجوئیوں کے سامنے وہ زیور بہت ہی حقیر معلوم ہوتے تھے۔

ادھر جس دن رما نے گنگو کی دکان سے زیور خریدے، اسی دن سے دوسرے صرافوں کو بھی اس کی قدردانی کی خبر ملی۔ رما جب ادھر سے نکلتا تو دونوں طرف کے دکاندار اٹھ اٹھ کر سلام کرتے۔ آیئے بابو جی، پان تو کھاتے جایئے، دو ایک چیزیں ہماری دکان سے بھی تو دیکھئے۔ رما کا خرم و احتیاط اس کی ساکھ کو اور بڑھا دیتا۔ یہاں تک کہ ایک دن ایک دلال رما کے گھر آ پہنچا اور اس کے نہیں نہیں کرنے پر بھی صندوقچہ کھول کر اس کے سامنے رکھ ہی دیا۔

رما نے اس سے پیچھا چھڑانے کے لیے کہا۔ ''بھائی اس وقت مجھے کچھ نہیں لینا ہے، کیوں اپنا اور میرا وقت برباد کرو گے؟''

دلال نے بڑی خوشامد سے کہا۔ ''بابو جی! دیکھ تو لیجیے، پسند آئے تو لیجیے گا، دیکھ لینے میں کوئی ہرج نہیں ہے؟ آخر رئیسوں کے پاس نہ جائیں تو کس کے پاس جائیں۔ اوروں نے آپ سے گہری رقمیں ماریں۔ ہمارے بھاگ میں بدا ہو گا تو ہمیں بھی آپ سے چار پیسے مل جائیں گے۔ بہو جی اور مائی جی کو دکھا لیجیے۔ میرا دل گواہی دیتا ہے کہ آپ کے ہاتھوں بہنی ہو گی۔''

رما: ''عورتوں کی پسند کی نہ کہو۔ چیزیں اچھی ہوں گی ہی، پسند آتے کیا دیر لگتی ہے۔ لیکن بھائی اس وقت ہاتھ خالی ہے۔''

دلال ہنس کر بولا۔ ''بابو جی! بس ایسی بات کہہ دیتے ہیں کہ وہ آپ کا حکم ہو جائے تو ہزار پانچ سو آپ کے اوپر نچھاور کریں۔ ہم لوگ آپ کا مزاج دیکھتے ہیں بابو جی، بھگوان نے چاہا تو آج میں سودا کر کے اٹھوں گا۔ دلال نے صندوقچی سے دو چیزیں نکالیں۔ ایک تو نئے فیشن کا جڑاؤ کنگن تھا اور دوسرا کانوں کا رِنگ۔ دونوں ہی چیزیں بے مثل تھیں۔ ایسی آب تھی، گویا چراغ جل رہا ہو۔ دس بج چکے تھے۔ منشی دیانا تھ دفتر جا چکے تھے۔ رما خود کھانا کھانے جا رہا تھا لیکن ان دونوں چیزوں کو دیکھ کر اس پر خود فراموشی کی حالت طاری ہوگئی۔ دونوں کیس لیے ہوئے گھر میں آیا، اس کے ہاتھ میں کیس دیکھتے ہی دونوں عورتیں ٹوٹ پڑیں اور ان چیزوں کو نکال نکال کر دیکھنے لگیں۔ ان کی چمک دمک نے انہیں فریفتہ کر لیا کہ ان میں عیب و حسن کا امتیاز ہی نہ رہا۔

جاگیشری: ''آج کل کی چیزوں کے سامنے تو پرانی چیزیں کچھ جچتی ہی نہیں۔''

جالپا: ''نہ جانے وہ عورتیں کیسے ان چیزوں کو پہنتی تھیں؟''

رما: ''پسند کیوں نہیں ہیں، اماں جی تم لے لو۔''

جاگیشری نے اپنے درد دل کو چھپانے کے لیے سر جھکا لیا۔ جس کی ساری عمر خانگی تفکرات میں کٹ گئی، وہ کیا آج خواب میں بھی ان زیوروں کے پہننے کی امید کر سکتی تھی۔ آہ، اس دکھیا کی زندگی کی کوئی مراد تو پوری نہ ہوئی۔ شوہر کی آمدنی کبھی اتنی نہ ہوئی کہ بال بچوں کی پرورش کے بعد کچھ پس انداز ہوتا۔ جب سے گھر کی مالکن ہوئی تب ہی سے گویا اس کی ریاضت شروع ہوئی اور ساری آرزوئیں ایک ایک کر کے خاک میں مل گئیں۔ اس نے ان زیوروں کی طرف

سے آنکھیں ہٹالیں۔ ان میں اتنی کشش تھی کہ وہ ان کی طرف تاکتے ہوئے ڈرتی تھی کہ کہیں اس کی بے نیازی کا پردہ نہ کھل جائے۔ بولی۔ ''میں لے کر کیا کروں گی بیٹی؟ میرے پہننے اوراوڑھنے کے دن تو نکل گئے۔ کون لایا ہے بیٹا؟ کیا دام مانگتا ہے؟''

رما: ''ایک صراف دکھانے لایا ہے، ابھی میں نے دام وام نہیں پوچھے۔ مگر دام اونچے ہوں گے۔ لینا تو تھا نہیں، پوچھ کر کیا کرتا؟''

جالپا: ''لینا نہیں تو یہاں لائے کیوں؟''

جالپا نے یہ الفاظ کچھ ایسے تحکم آمیز لہجے میں کہے کہ رما کھسیا گیا۔ ان میں کچھ ایسی تحریک، کچھ ایسی ملامت اور کچھ ایسا اشتیاق تھا کہ وہ ان چیزوں کو واپس نہ لے جا سکا۔ بولا:

''تو لے آؤ؟''

جالپا: ''اماں لینے ہی کو نہیں کہتیں تو لے کر کیا کرو گے؟ کیا مفت میں دے رہا ہے؟''

رما: ''سمجھ لو مفت ہی ملتے ہیں۔''

جالپا: ''سنتی ہو اماں ان کی باتیں، آپ جا کر لوٹا آئیے۔ جب ہاتھ میں روپے آ جائیں گے تو بہت گہنے ملیں گے۔''

جاگیشیری نے پرہوس انداز میں کہا۔ ''روپے ابھی تو نہیں مانگتا؟''

جالپا: ''ادھار بھی دے گا تو سود تو لگا ہی لے گا۔''

رما: ''تو لوٹا دوں؟ ایک بات چٹ پٹ طے کر ڈالو۔ لینا ہو لے لو، نہ لینا ہو تو

لوٹا دو۔ پس وپیش میں نہ پڑو۔''

جالپا کو یہ بے لاگ انداز گفتگو اس وقت بہت ناگوار معلوم ہوا۔ انکار کرنا اس کا کام تھا۔ رما کو تو لینے کے لیے اصرار کرنا چاہیے تھا۔ اسے ایسا معلوم ہوا کہ رما کے دل میں ذرا بھی احساس، ذرا بھی درد نہیں ہے۔ جاگیشری کی طرف ہوسناک نگاہوں سے دیکھ کر بولی:

''لوٹا دو.....رات دن کے تقاضے کون لے گا؟''

وہ کیسوں کو بند کرنے ہی والی تھی کہ جاگیشری نے کنگن اٹھا کر پہن لیا۔ گویا چھن بھر پہن لینے ہی سے اس کی ہوس پوری ہو جائے گی۔ پھر دل میں اس اوچھے پن پر شرمندہ ہو کر وہ اسے اتارنا ہی چاہتی تھی کہ رما نے کہا۔ ''اب تم نے پہن لیا ہے، اماں تو پہنے رہو۔ میں اسے تمہاری نذر کرتا ہوں۔''

جاگیشری کی آنکھیں پرنم ہو گئیں۔ جو آرزو آج تک نہ پوری ہوئی، بیٹے کی سعادت مندی کی بدولت پوری ہوئی تھی، لیکن کیا وہ اپنے عزیز بیٹے پر قرض کا اتنا بوجھ رکھ دے گی۔ ابھی اس غریب کی حیثیت ہی کیا ہے۔ نہ جانے روپے جلد ہاتھ آئیں یا دیر میں۔ قیمت بھی تو نہیں معلوم، اگر دام اونچے ہوئے تو دے گا کہاں سے؟ اسے کتنے تقاضے سہنے پڑیں گے اور کتنا شرمندہ ہونا پڑے گا۔ پست ہمت ہو کر بولی۔ ''نہیں بیٹا! میں نے یونہی پہن لیا، لے جاؤ، لوٹا دو۔''

ماں کا اداس چہرہ دیکھ کر رما کا دل دہل اٹھا۔ کیا قرض کے خوف سے وہ اپنی بے نفس ماں کی اتنی خدمت بھی نہ کر سکے، ماں کی جانب اس کا کچھ فرض بھی تو ہے۔ بولا:

''روپے بہت مل جائیں گے اماں، تم اس کی فکر مت کرو۔''

جاگیشری نے بہو کی طرف دیکھا۔ گویا کہہ رہی تھی کہ لڑکا مجھ پر کتنا ظلم کر رہا ہے۔

جالپا بے غرضیانہ انداز سے بیٹھی ہوئی تھی۔ شاید اسے خوف ہو رہا تھا کہ رما یہ کنگن نہ لے لیں۔ اس کے بشرے سے جاگیشری کو معلوم ہو گیا۔ اسے میرا کنگن پہننا ناگوار گزرا۔ اس نے فوراً کنگن اتار ڈالا اور جالپا کی طرف بڑھا کر بولی۔ ''میں اپنی طرف سے تمہیں دیتی ہوں۔ بہو مجھے جو کچھ پہننا اوڑھنا تھا، پہن اوڑھ چکی۔ اب تم ذرا پہنو۔ دیکھوں۔''

جالپا کو اس میں مطلق شبہ نہ تھا کہ اماں کے پاس روپے موجود ہیں۔ وہ سمجھی شاید آج دیوی پسیج گئی ہیں۔ ایک لمحہ پہلے اس نے سمجھا تھا کہ روپے رما کو دینے پڑیں گے۔ اس لیے خواہش رہنے پر بھی وہ اسے واپس کر دینا چاہتی تھی۔ جب اماں دام دینے کو تیار تھیں، تو انکار کرنے کی کیا ضرورت۔ اوپرے دل سے بولی:

''روپے نہ ہوں تو رہنے دیجیے۔ ابھی کون جلدی ہے؟''

رما نے چڑ کر کہا۔ ''تو تم یہ کنگن لے رہی ہو؟''

جالپا: ''اماں نہیں مانتیں تو ہم کیا کریں؟''

رما: ''تو ان رنگوں کو بھی کیوں نہیں رکھ لیتی؟''

جالپا: ''جا کر دام تو پوچھ آؤ۔''

رما: ''تم ان چیزوں کو لے جاؤ۔''

رما نے باہر آ کر دالان سے دام پوچھے تو سناٹے میں آ گیا۔ کنگن سات سو کے

تھے اور رنگ ڈیڑھ سو کے۔ اس کا اندازہ تھا کہ کنگن زیادہ سے زیادہ تین سو کے ہوں گے اور رنگ چالیس پچاس کے۔ پچھتایا کہ ان چیزوں کے دام پہلے ہی کیوں نہ پوچھ لیے۔ نہیں تو اندر جانے کی نوبت ہی کیوں آتی۔ مگر کچھ بھی ہو۔ واپس تو کرنا ہی پڑے گا۔ اتنا بڑا بوجھ وہ سر پر نہیں لے سکتا۔ دلال سے بولا۔ ''بڑے مہنگے ہیں، بھائی میرا اندازہ تو تین چار سو کے اندر ہی تھا۔''

دلال کا نام چرن داس تھا۔ بولا۔ ''دام میں ایک کوڑی کا فرق پڑ جائے سرکار! تو منہ نہ دکھاؤں۔ الٰہ دھنی رام کی کوٹھی کا تو مال ہے۔ آپ چل کر پوچھ لیں۔ چھدام روپے کی دلالی البتہ میری ہے۔ آپ کی مرضی ہے دیجیے یا نہ دیجیے۔''

رما: ''تو بھئی ان داموں کی چیزیں تو اس وقت ہم نہیں لے سکتے۔''

چرن داس: ''ایسی بات نہ کہیے بابو جی۔ آپ کے لیے اتنے روپے کون بڑی بات ہے۔ آپ سے بڑھ کر دوسرا کون شوقین ہوگا۔ یہ سب رئیسوں ہی کی پسند کی چیزیں ہیں۔ گنواران کی قدر کیا جانے؟''

رما: ''ساڑھے آٹھ سو بہت ہوتے ہیں بھائی!''

چرن داس: ''روپوؤں کا منہ نہ دیکھئے بابو جی، جب بہو جی پہن کر بیٹھیں گی تو ایک نگاہ میں سارے روپے وصول ہو جائیں گے۔''

رما کو یقین تھا کہ جالپا زیوروں کی یہ قیمت سن کر آپ ہی بدک جائے گی۔ دلال سے اور زیادہ بات نہ کی۔ اندر جا کر زور سے ہنسا اور بولا۔ ''آپ نے اس کنگن کا کیا دام سمجھا تھا اماں؟''

جاگیشری کوئی جواب دے کر بے وقوف نہ بننا چاہتی تھی۔ بولی۔ ''ان جڑاؤ

چیزوں میں ناپ تول کا تو کوئی حساب ہوتا نہیں۔ جتنے میں طے ہو جائے، وہی ٹھیک ہے۔''

رما: ''اچھا تم بتاؤ جالپا؟''

جالپا: ''چھ سو سے کم نہیں ہے۔''

رما نے قیمت کا خوف کھا کر ان چیزوں کو واپس کر دینا چاہا تھا، مگر اس میں اسے کامیابی نہ ہوئی۔ چھ اور سات میں تھوڑا ہی فرق تھا اور ممکن ہے چرن داس چھ سو ہی میں راضی ہو جائے۔ کچھ جھینپ کر بولا:

''کچے نگینے نہیں ہیں؟''

جالپا: ''کچھ بھی ہو، چھ سو سے زیادہ کا نہیں ہے۔''

''اور رنگ؟''

''زیادہ سے زیادہ سو روپے۔''

''یہاں بھی چوکیں، ڈیڑھ سو مانگتا ہے۔''

''جٹو ہے کوئی۔ ہمیں ان داموں لینا ہی نہیں۔''

رما کی چال الٹی پڑی۔ جالپا کو ان چیزوں کی قیمت کے بارے میں بہت غلط فہمی ہوئی تھی، لیکن سات سو ہی کوئی چھوٹی رقم ہے۔ آخر جالپا اس کی مالی حالت سے تو واقف تھی۔ پھر بھی سات سو روپے کی چیزوں کے لیے منہ کھولے بیٹھی تھی۔ رما کو کیا معلوم تھا کہ رما کچھ اور ہی سمجھ کر کنگن پر لہرائی تھی۔ اب تو گلا چھوٹنے کی ایک ہی تدبیر تھی اور وہ یہ کہ دام چھ سو پر راضی نہ ہو۔ بولا۔ ''وہ ساڑھے آٹھ سو سے کوڑی کم نہ لے گا۔''

جالپا: ''تو لوٹا دو، نہیں چلو۔ میں پوچھتی ہوں۔''

رما کی روح فنا ہوگئی۔ دلال راضی ہوگیا تو پھر اس کے بنائے کچھ نہ بنے گا۔

جالپا دالان میں آ کر بولی۔ ''ذرا یہاں آنا جی۔ او صراف! لوٹنے آئے ہو یا مال بیچنے آئے ہو۔ سات سو روپے کنگن کے مانگتے ہو؟''

چرن داس: ''سات سو تو اس کی کاریگری کے دام ہیں حجور۔''

جالپا: اچھا جو اس پر سات سو نچھاور کرے، اس کے پاس لے جاؤ۔ یہاں تو دونوں چیزوں کے سات سو ملیں گے۔''

چرن داس: ''بہو جی! آپ تو اندھیر کرتی ہو۔ کہاں ساڑھے آٹھ سو اور کہاں سات سو!''

جالپا: ''تمہاری خوشی، اپنی چیز لے جاؤ۔''

چرن داس نے خوشامد کرتے ہوئے کہا۔ ''اتنے بڑے دربار میں آ کر چیز لوٹا لے جاؤ۔ آپ یونہی پہنیں۔ دس پانچ کی بات ہوتی تو آپ کی زبان نہ پھیرتا۔ آپ سے جھوٹ نہیں کہتا۔ ان چیزوں پر پیسہ روپیہ نفع ہے۔ اسی ایک پیسے میں دکان کا بھاڑا۔ دستوری دلالی سب سمجھئے۔ ایک بات ایسی سمجھ کر کہہ دیجیے کہ ہمیں بھی چار پیسے مل جائیں سویرے سویرے لوٹنا نہ پڑے۔''

جالپا نے بے اعتنائی سے کہا۔ ''کہہ دیئے وہی سات سو۔''

چرن داس نے ایسا منہ بنایا گویا اس کی رقم ڈوبی جا رہی ہو۔ اور بولا۔ ''بہو جی! ہے تو گھاٹا ہی مگر آپ کی بات نہیں ٹالتے بنتی۔ روپے کب ملیں گے؟''

جالپا نے گھر میں جاتے ہوئے کہا۔ ''جلدی ہی مل جائیں گے۔''

جالپا اندر آ کر بولی۔ ''آخر دیا کہ نہیں، ڈیڑھ سو صاف اڑائے جاتا تھا۔ مجھے افسوس ہو رہا ہے کہ کچھ اور کم کیوں نہ کہا۔''

رما کچھ نہ بولا۔ اس کی چالیں کچھ الٹی پڑیں کہ چاروناچار اس کی گردن پر بوجھ لد ہی گیا۔ جالپا تو خوشی کی امنگ میں دونوں چیزیں لیے اوپر چلی گئی، مگر رما سر جھکائے خاموش کھڑا تھا۔ جالپا نے اس کی حالت جان کر بھی ان چیزوں سے کیوں انکار نہ کر دیا۔ کیوں زور دے کر نہیں کہا کہ میں نہ لوں گی انہیں، واپس کر دو۔ اسے اس کا رنج تھا۔ آخر اس نے اپنے دل کو سمجھایا۔ یہ اپنی ہی حماقتوں کا کنارہ ہے۔ یہ میری ہی غلطی ہے۔ مجھے دلال کو دروازے ہی سے دھتکار دینا چاہیے تھا۔

کھانا کھا کر جب رما اوپر کپڑے پہننے گیا تو جالپا آئینے کے سامنے کھڑی کانوں میں رنگ پہن رہی تھی۔ اسے دیکھ کر بولی۔ ''آج کسی اچھے کا منہ دیکھ کر اٹھی تھی۔ دو چیزیں مفت ہاتھ آ گئیں۔''

رما نے تعجب سے پوچھا۔ ''مفت کیوں؟ روپے نہ دینے پڑیں گے؟''

جالپا: ''روپے تو ماں جی دیں گی۔''

رما: ''کیا کچھ کہتی تھیں؟''

جالپا: ''انہوں نے میری نذر کیے ہیں تو روپے کون دے گا؟''

رما نے اس کے بھولے پن پر مسکرا کر کہا۔ ''یہ سمجھ کر تم نے یہ چیزیں لے لیں۔ اماں کو دینا ہوتا تو اسی وقت دے دیتیں، جب چوری ہوئی تھی۔''

جالپا پریشانی میں پڑ گئی۔ بولی۔ ''تو مجھے کیا معلوم تھا۔ اب بھی تو لوٹا سکتے ہو۔

کہہ دینا جس کے لیے یہ چیزیں لی تھیں، اسے پسند نہیں آئیں۔''

یہ کہہ کر اس نے فوراً کانوں سے رنگ نکال لیے۔ کنگن بھی اتار ڈالے اور دونوں چیزیں کیسوں میں رکھ کر اس کی طرف اس طرح بڑھائے، جیسے کوئی بلی چوہے سے کھیل رہی ہو۔ کیا بلی چوہے کو اپنی گرفت سے باہر ہونے دیتی ہے۔ وہ اسے چھوڑ کر بھی نہیں چھوڑتی۔ جالپا کا ہاتھ پھیلا ہوا تھا، لیکن چہرے پر ہوائیاں اڑ رہی تھیں۔ کیوں وہ رما کی طرف دیکھ کر زمین کی طرف دیکھ رہی تھی۔ کسی مصیبت سے سبکدوش ہو جانے پر جو دلی مسرت ہونی چاہیے، وہ کہاں تھی؟ اس کی حالت ٹھیک اسی ماں کی سی تھی، جو اپنے بیٹے کو پردیس جانے کی اجازت دے رہی ہو۔ وہی مجبوری وہی کشمکش اس کے چہرے پر جھلک رہی تھی۔

رما اتنا بے درد نہ تھا کہ وہ چیزیں اس کے ہاتھ سے لے لیتا۔ اسے تقاضے سہنا، شرمندہ ہونا، منہ چھپائے پھرنا اور فکر کی آگ میں گھلنا سب کچھ منظور تھا، مگر جالپا کو مایوس نہ کر سکتا تھا۔

اس نے مسکرا کر کہا۔ ''رہنے دو، اب لے لیا ہے تو کیا لوٹائیں؟ اماں بھی ہنسیں گی۔''

جالپا نے مصنوعی مآل اندیشی سے کہا۔ ''اپنی چادر دیکھ کر پاؤں پھیلانا چاہیے۔ ایک نئی مصیبت مول لینے کی کیا ضرورت ہے؟''

رما نے گویا پانی میں ڈوبتے ہوئے کہا۔ ''ایشور مالک ہے۔'' اور فوراً نیچے چلا گیا۔

ہم عارضی شرم و لحاظ میں پڑ کر اپنی زندگی کے سکون اور عافیت کا کیسے خون کر

دیتے ہیں۔ اگر جالپا حسن کے اس جھونکے میں اپنے مستقبل کو رکھ سکتی۔ اگر رما جھوٹے لحاظ کے آگے سر نہ جھکا دیتا۔ دونوں کے دلوں میں سچی ہمدردی ہوتی تو وہ گمراہ ہو کر تباہی کی طرف کیوں گامزن ہوتے۔

گیارہ بج گئے تھے۔ دفتر کے لیے دیر ہو رہی تھی۔ مگر رما اس طرح جا رہا تھا جیسے اپنے کسی عزیز کو دفن کر کے لوٹ رہا ہو۔

(15)

جالپا اب وہ خلوت پسند نازنین نہ تھی، جو دن بھر منہ لپیٹے اداس پڑی رہتی تھی۔ اسے اب گھر میں بیٹھنا اچھا نہ لگتا تھا۔ اب تک وہ مجبور تھی۔ کہیں آ جا نہ سکتی تھی۔ اب خدا کے فضل سے اس کے پاس بھی گہنے ہو گئے تھے۔ پھر وہ گوشۂ تنہائی میں کیوں پڑی رہتی۔ زیور لباس کوئی مٹھائی نہیں ہے، جس کی لذت تنہائی میں حاصل کی جا سکے۔ محلے یا برادری میں کہیں سے بلاوا آتا تو وہ ساتھ ضرور جاتی۔ کچھ دنوں کے بعد ساس کی ضرورت بھی نہ رہی۔ وہ اکیلی ہی آنے جانے لگی۔ اس کی شکل وصورت، زیور، لباس اور آداب واخلاق نے تھوڑے ہی دنوں میں اسے محلے کی عورتوں میں اعزاز کے رتبے پر پہنچا دیا۔ اس کے بغیر محفل سونی رہتی۔ اس کے گلے میں اتنا لوچ تھا، انداز گفتگو اتنا دل آویز اور ادائیں اتنی دلکش کہ وہ محفل کی رانی معلوم ہوتی تھی۔ روز ہی کہیں نہ کہیں عورتوں کا جماؤ ہو جاتا۔ گھنٹے دو گھنٹے گا بجا کر یا گپ شپ کر کے عورتیں دل بہلا لیا کرتیں۔ پھاگن میں پندرہ دن برابر گانا ہوتا رہا۔ کبھی کسی کے گھر، کبھی کسی کے گھر۔ جالپا نے جیسا حسن پایا تھا، ویسا ہی فیاض دل بھی پایا تھا۔ مہمان نوازیوں کا خرچ بیشتر اس کے ذمے آتا۔ کبھی کبھی